ہوتے ہیں۔ ''خیر تو تھی؟'' صبح سویرے وہ پارک کے اندر کے لمبے فٹ پاتھ پر شمالاً جنوباً سیر کرتی ہے، پھر ایک مخصوص جھولے (پینگ) پر جھولا جھولتی ہے۔ اس کا وقت، اس کی جگہ، اس کا رُخ، اس کی رفتار اور اس کا لباس ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مجھے تو ہر لحاظ سے وہ فوجی لگتی ہے، لباس بھی یونیفارم سا لگتا ہے۔ شکل کی قبول صورت ہے، رنگ کھلتا، گندمی، قد درمیانہ، جسم قدرے فربہ، آنکھیں خوبصورت اور چال سپاہیانہ ہے۔ اصل چیز اس کے ڈسپلن اور جھولے سے لطف اندوز ہونے کا اسٹائل ہے، جس کی طرف بندہ توجہ دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سیر سے تھک کر جب وہ جھولے پر جا بیٹھتی ہے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی ہے۔ اس کا جھولا بھی مخصوص ہے، اس کے علاوہ میں نے اسے کسی اور جھولے پر نہیں دیکھا، چھٹی والے دن اس کے ساتھ ایک دو اور بھی کم عمر لڑکیاں ہوتی ہیں، لیکن یہ اسی مخصوص جھولے پر ہی ہوتی ہے۔ جھولتے ہوئے جب اس کے گلے میں لٹکا دوپٹا اور اس کی پونی ہوا میں لہراتے ہیں تو پارک میں اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ جھولے پر رہتی بھی بڑی دیر تک ہے، وہ کچھ گنگناتی بھی رہتی ہے، لیکن پتا نہیں کیا۔ وہ جھولے پر زیادہ سے زیادہ اوپر جانے کی کوشش کرتی ہے، لیکن کبھی کھڑے ہو کر پینگ نہیں چڑھاتی۔ وہ جھولے پر بہت مسرور نظر آتی ہے، اس کی ہر ادا سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی ہے۔ کئی دفعہ میں نے اسے جھولے پر موبائل پر باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ اُڑنے کی شوقین لگتی ہے، میں نے اسی لیے اس کا نام ''گڈی'' رکھا ہوا ہے۔ میری آج تک اس سے بات نہیں ہوئی، یہ تو بس راستے کے ایک منظر کی طرح سے ہے جو بندے کو اچھا لگے تو اسے دیکھنے کو دل کرتا ہے۔ دیکھنے کو رُک بھی جاتا ہے اور جس دن نہ دیکھے کوئی کمی سی بھی محسوس کرتا ہے۔

ایک روز پارک کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے گڈی کے پاس ایک شخص کو کھڑے دیکھا تو میں چونکا۔ کوئی کچھ کہنے یا بلانے آیا ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا، گو کہ کوئی ایسی عجیب چیز نہیں تھی، لیکن چونکا دینے والی چیز اس شخص کی شکل و صورت تھی، جو مجھے کافی مانوس سی لگی۔ کچھ دیر وہیں رُک کر میں اسے دیکھتا رہا، لیکن یاد نہ آیا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔ جب احساس ہوا کہ لوگ میرے اس طرح دیکھنے کو محسوس نہ کر رہے ہوں تو میں آفس چلا گیا۔ آفس پہنچ کر پھر تسلی سے ذہن پر زور دیا تو یاد آ گیا کہ یہ تو کرنل انور خان کا فارم منیجر تھا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شکل اس سے ملتی ہو، اس لیے گڈی سے تصدیق کرنے کا فیصلہ کیا۔

انور خان کے منیجر کو دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ سارا دن ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کی فلم سی چلتی رہی۔ گڈی کے گھر کا پتا نہیں تھا، اس لیے دوسرے دن کا انتظار مجبوری تھی۔

دوسری صبح جب میں گڈی کے پاس گیا تو وہ جھولے پر ہی موجود تھی۔ مجھے قریب کھڑے دیکھ کر اس نے جھولا روک دیا اور پوچھا۔

''جی انکل، کوئی کام ہے، مجھ سے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کل آپ کے پاس ایک صاحب کھڑے تھے، ان کی شکل مجھے کافی مانوس سی لگی تھی، لگتا ہے ان سے تمہاری پرانی ملاقات ہے۔ وہ کون تھے اور کیا کرتے ہیں؟'' میں نے ایک ہی سانس میں سارے سوال کر ڈالے۔

''پہلے فوج میں رہے، پھر ایک ایگریکلچر فارم کے منیجر رہے اور اب گھر پہ ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔'' گڈی نے اطمینان سے جواب دیا۔ بس مجھے اتنی ہی معلومات کی ضرورت تھی۔ تصدیق ہو گئی کہ وہ انور خان کا منیجر ہی تھا۔ میں نے گڈی کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔ تصدیق کیا ہوئی یادوں کی بارات ہی چل پڑی۔ بارات گڈی کے جھولے سے اسے اور اس کے والد کو لے کر چلی تو سیدھی لاہور جا پہنچی، پھر وہاں سے کرنل انور کو بھی ساتھ لیا اور کوئٹہ پہنچ گئی، پھر وہاں سے گھومتی گھامتی واپس گڈی کے جھولے پر آ گئی، چلیے آپ کو بھی بارات کے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

لاہور کا پوسٹنگ آرڈر آیا تو میں ساہیوال میں نیشنل گارڈ میں تھا۔ کسی پنجابی کے لیے لاہور کی پوسٹنگ خوشی کی خبر ہوتی ہے، لیکن میرے لیے یہ کئی اور لحاظ سے بھی اچھی خبر تھی۔ پہلی چیز تو یہ تھی کہ کسی اچھی جگہ کی پوسٹنگ کے بعد عموماً پوسٹنگ نسبتاً ''ہارڈ ایریا'' یعنی

مشکل اور دور کی جگہ ہوتی ہے، اس لحاظ سے ساہیوال سے لاہور پوسٹنگ بڑی اچھی تھی۔ دوسرا پنجابی ہونے کے باوجود میں نے آج تک لاہور کو ٹھیک طرح سے نہیں دیکھا تھا، بس مسافروں کی طرح آتے جاتے ہی دیکھا تھا، گویا میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کہ پنجاب میں کہتے ہیں ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔'' اس پوسٹنگ سے مجھے پیدا ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ نزدیک ہونے کی وجہ سے وہاں جانا اور شفٹ کرنا بھی آسان تھا۔ گھر سے قریب ہونے کی وجہ سے دُکھ سکھ میں شرکت بھی آسان تھی۔

رپورٹ کرنے سے پہلے یونٹ سے رابطہ ضروری تھا، تاکہ پتا چلے کہ گھر مل جائے گا یا نہیں، تاکہ فیملی کی شفٹنگ کے متعلق فیصلہ کیا جا سکے۔ شادی شدہ لوگوں کے لیے فیملی کی شفٹنگ بھی بڑا مسئلہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے لیے بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ رابطہ کیا تو پتا چلا کہ گھر تو مل جائے گا لیکن یونٹ کوئٹہ جانے کی تیاریوں میں ہے۔ آرڈرل چکے ہیں اور دو مہینے تک کوئٹہ روانگی ہے، گویا پوسٹنگ لاہور کی نہیں بلکہ کوئٹہ کی تھی، لاہور کا تو بس بیچ میں محض نام ہی تھا۔ اب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں خود اکیلا لاہور چلا جاؤں اور فیملی بعد میں ڈائریکٹ کوئٹہ چلی جائے، لیکن میں چونکہ پہلے ایک دفعہ ملٹری اسپیشل ٹرین میں سفر کر چکا تھا، اس لیے ہم نے پہلے فیملی کے ساتھ لاہور جانے اور پھر یونٹ کے ساتھ ملٹری اسپیشل میں کوئٹہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ملٹری اسپیشل ٹرین میں سفر کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔ ویسے بھی اس میں سوائے نام کے اور کچھ بھی اسپیشل نہیں ہوتا، کیوں کہ اس میں کوئی بھی جدید سہولت میسر نہیں ہوتی۔ اس میں ایئر کنڈیشنڈ یا لوئر ایئر کنڈیشنڈ وغیرہ کا کوئی ڈبا نہیں ہوتا۔ فرسٹ کلاس ہی سب سے اعلیٰ درجہ ہوتا ہے۔ لیکن اسے ملٹری اسپیشل صرف اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ملٹری کو لانے اور لے جانے کے لیے ہی مخصوص ہوتی ہے اور اس میں سویلین لوگ سفر نہیں کر سکتے۔ اصل میں اسے اسپیشل اس میں سفر کرنے والے بناتے ہیں، چوں کہ اس میں سارے اپنی ہی یونٹ کے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے یہ سارا سفر ہی پکنک بن جاتا ہے، ورنہ تو سہولتوں کا فقدان اسے سفر سے ''سفرنگ'' بنا دیتا ہے۔

ساہیوال سے لاہور چھوٹا سا سفر ہے، اس لیے ٹرین سے جانا مناسب نہ تھا۔ سامان کا جانا ہی مسئلہ تھا، اس لیے اسے ٹرک سے لے جانے کا فیصلہ کیا گیا، بقول ڈاکٹر یونس بٹ ''سفر میں سب سے بھاری سامان بیوی ہی ہوتی ہے۔'' لیکن ہم نے انہیں کار ہی میں لے جانا مناسب سمجھا۔ مقررہ تاریخ پر میں نے اکیلے ہی یونٹ میں رپورٹ کی، گھر وغیرہ ٹھیک کرایا اور پھر کوئی ہفتے بھر بعد نیلی کو بھی لاہور شفٹ کر لیا۔ ہمارا یہ ہفتہ آفیسرز میس میں گزرا۔ بال بچوں کے ساتھ کافی عرصہ گزارنے کے بعد چھڑوں کے میس میں رہنا بھی بڑی عیاشی ہوتی ہے، شادی کے بعد تو یہ موقع کم ہی نصیب ہوتا ہے اور پھر یہ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے والی بات ہوتی ہے۔

یونٹ جانے کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی، ہم بھی لگ گئے۔ میں اس سے پہلے کئی یونٹوں میں سروس کر چکا ہوں، اس لیے یونٹ کی زندگی کوئی نئی چیز نہیں تھی، لیکن اس یونٹ میں مجھے کچھ عجیب سی گھٹن اور خوف کی فضا محسوس ہوئی۔ سب لوگ مجھے خوف زدہ سے اور جلدی میں محسوس ہوئے، جیسے کوئی لاٹھی لے کر ان کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ مجھے یہاں کوئی بھی خوش دلی اور شوق سے کام کرتا ہوا نظر نہ آیا، بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ جیسے لوگ مجبوراً کر رہے ہوں۔ اس لیے کام بھی یہاں ''ڈنگ ٹپاؤ'' یعنی وقت گزاری کے طور پر ہی ہو رہے تھے۔ اگر شوق اور جذبہ نہ ہو تو کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے اس کی وجہ بھی جلد ہی معلوم ہو گئی۔ اس کی اصل وجہ یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل انور احمد خان تھے، جنہیں لوگوں کو اذیت میں مبتلا رکھنے میں شاید مزا آتا تھا۔ میں نے انہیں کسی سے بھی سیدھے منہ بات کرتے ہوئے کبھی نہ دیکھا۔ وہ اپنے سے جونیئر کو تو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔

فوج میں طریقہ ہے کہ ہر نئے آنے والے افسر کا کمانڈنگ افسر سے انٹرویو ہوتا ہے۔ انٹرویو تو ہمارا بھی ہوا تھا لیکن عجیب و غریب، خوامخواہ کی کشیدگی کے ماحول میں جیسے کوئی پرانی ناراضگی ہو۔ ذرا بھی اپنائیت اور خوشی کا اظہار نہ کیا گیا تھا۔ لہجہ بالکل روکھا اور خشک جیسے مجبوراً ملے ہوں۔ گردن ایسی اکڑی ہوئی جیسے اس میں سریا فٹ ہو، یہی ماحول یونٹ میں ہر طرف نظر آیا۔ مجھے تو یقین

نہیں آتا تھا کہ صرف ایک شخص کی وجہ سے پوری یونٹ کا ماحول اتنا کشیدہ ہوسکتا ہے، لیکن آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

جب کوئی ملٹری یونٹ کسی کینٹ سے رخصت ہوتی ہے تو اسے بڑے پُرتکلف اور متاثر کن انداز میں ''بینڈ باجے'' کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ بینڈ باجا تو خوشی کے موقع پر بجایا جاتا ہے، یہ تو الوداعی پروگرام ہے، اس میں پھر بینڈ باجا کیسا، کہیں یونٹ سے جان تو نہیں چھڑائی جارہی تھی، لیکن ہر موقع کے لیے ملٹری بینڈ کی علیحدہ دھن ہوتی ہے۔ اگر خوشی کی ہے تو غم کی بھی ہے، استقبالیہ ہے تو الوداعی بھی ہے۔ ایسے موقع پر الوداعی دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ یہ الگ چیز ہے کہ ان الوداعی دھنوں پر بھی لوگ ناچتے ہیں۔ اس یونٹ کا بھی پلیٹ فارم پر ہی سارا الوداعی پروگرام ہوا۔ پُرتکلف چائے وغیرہ دی گئی۔ اس میں شرکت کے لیے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب کچھ ہوگیا تھا بس آخری مرحلہ رہ گیا تھا، وہ تھا رُخصت کرنے والوں اور رخصت ہونے والوں کے ہاتھ ہلانے اور خدا حافظ کہنے کا، لیکن یہ مرحلہ کافی لمبا ہوگیا۔ ٹرین چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہم رخصت ہونے والوں سے زیادہ تو رخصت کرنے والے بے چین ہوں گے، کہیں ٹرین چلے تو وہ بھی فارغ ہوکر گھروں کو جائیں یا کوئی اور کام کریں۔

ملٹری اسپیشل کا یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ نام تو اس کا اسپیشل ٹرین ہے، لیکن ترجیحات میں یہ سب سے آخر میں آتی ہے۔ پہلے عام مسافر ٹرینیں گزاری جاتی ہیں، پھر جب سب گزر جاتی ہیں تو پھر اس کی باری آتی ہے۔

سب کی طرح فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے کرنل صاحب بھی ٹرین کے چلنے میں تاخیر کی وجہ سے سخت بے چین تھے، بلکہ وہ دوسروں سے زیادہ مضطرب تھے۔ وہ شاید اپنی طبیعت کے علاوہ اپنے مہمان کی وجہ سے بھی بڑی خفت محسوس کررہے ہوں، جو انہیں رخصت کرنے آیا ہوا تھا۔ یہ ادھیڑ عمر کا لمبا چوڑا اور قدرے موٹا سا شخص تھا، جسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ شلوار قمیص پر واسکٹ پہنے اس شخص کو اس کے ضرورت سے زیادہ عاجزانہ اور خوشامدانہ رویے کی وجہ سے سب نے ہی نوٹ کیا۔ اسی شخص کو میں نے آج گڈی کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے ڈبے کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کرنل صاحب نے روانگی میں تاخیر کی وجہ معلوم کرنے کے لیے کہا۔ میں نے پتا کیا تو اسٹیشن والوں کے پاس بڑا آسان سا جواب تھا کہ فلاں ٹرین آرہی ہے وہ گزر جائے تو چلاتے ہیں۔ یہی جواب میں نے کرنل صاحب کو بتادیا۔ کرنل صاحب کی حالت کا سب کو اندازہ تھا، وہ کس قدر خون کے گھونٹ پی رہے ہوں گے، لیکن کرہی کیا سکتے تھے۔ کس کو جھاڑیں، کس کی بے عزتی کریں، یہ کوئی فوج تو تھی نہیں کہ ان کی تھانیداری چلتی اور ریلوے والے ان کے ماتحت تو تھے نہیں جن پر وہ رعب جھاڑتے، خدا خدا کرکے ٹرین چلی تو دونوں طرف سے ہاتھ ہلائے گئے۔ خدا حافظ اور خدا ہی حافظ کے جملوں کا تبادلہ ہوا۔ ہم لوگ مسکراہٹوں کے سائے میں روانہ ہوئے۔

ٹرین تیسرے دن آرام سے روہتی سسکتی کوئٹہ پہنچی، کیوں کہ ریلوے والوں کو کوئی جلدی تھی اور نہ ہی ہمیں، اس طرح کے دیر سویر سے ہماری صحت پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ دیر ہو بھی جاتی تو نہ ریلوے والوں کا کچھ بگڑنا تھا نہ ہمارا۔ یہ تو ایسا سفر تھا کہ جس کی منزل کہیں بھاگ کر نہیں جاسکتی تھی، بلکہ یوں کہیے کہ خود ہمارا سفر ہی منزل تھا۔ ریلوے والوں کو پتا تھا کہ وہ ملازم سرکار کے ہیں۔ اگر یہ سفر، یہ ڈیوٹی ختم ہوگئی تو کوئی دوسری شروع ہوجائے گی، پھر ہم نے بھی تو وہاں یہی کچھ کرنا تھا جو ہم ٹرین میں کررہے تھے۔ وہاں بھی پریڈیں ہی تھیں، یہاں بھی پریڈیں ہی ہیں۔ یادرکھیں فوج کبھی آغاز سے انجام تک پریڈ ہی رہتی ہے، راستے میں جہاں بھی کھانے کا وقت ہوتا، ٹرین سائیڈ پلیٹ فارم پر روک دی جاتی۔ کھانا پکتا اور پھر منظم طریقے سے سب کو کھلایا جاتا۔ یہ سب کچھ بھی پریڈ ہی کی طرح ہوتا تھا، پھر کھانے پینے کے بعد ریلوے والوں کو بتادیا جاتا تھا کہ ہم لوگ روانگی کے لیے تیار ہیں تو وہ ٹریفک اور موقع دیکھ کر ٹرین پھر سے روانہ کردیتے۔

ٹرین روکنا ہمارے اختیار میں تھا، لیکن چلانا ریلوے والوں کے اختیار میں۔ ویسے تو لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے بہت سے پروگرام وغیرہ بنے تھے، لیکن سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ٹرین جہاں بھی رُکتی

کوہ گراں بن جاتی، پھر وہاں سے اس کا چلنا بھی جاں سے گزرنا ہی ہوتا۔

سفر کے دوران وقت گزاری کے لیے کرنل صاحب کے سوا سب ہی ڈبوں میں تفریحی پروگرام چلتے رہے۔ اس میں آفیسر فیلڈ میس خاص طور پر متحرک رہی۔ ہر یونٹ میں ایک فیلڈ میس ہوتی ہے جس کا کام جنگ، جنگی اور تربیتی مشقوں اور سفر وغیرہ میں افسروں کے طعام اور تفریح وغیرہ کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ تفریح کا بھی کافی سامان ہوتا ہے، مثلاً ٹیلی ویژن، وی سی آر، تاش، ڈرافٹ اور شطرنج وغیرہ۔ اس کے علاوہ اگر کہیں جانا ہو تو سفر اور علاقے کی ضروریات کے مطابق اور چیزیں بھی رکھ لی جاتی ہیں۔ اس سفر کے دوران اسے بھی خدمت کا خوب موقع ملا۔ کرنل صاحب البتہ نہ خود ڈبے سے باہر نکلے اور نہ کسی نے ان کے ڈبے میں جانے کی جرأت کی، لیکن ٹرین روکنے اور چلانے کے لیے ان سے اجازت اگر لی جاتی تھی یا پھر پروگرام میں اگر کوئی تبدیلی ہوتی تو انہیں رپورٹ کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون وغیرہ تو ہوتے نہیں تھے، اس لیے متعلقہ اسٹاف کو رپورٹ کے لیے خود جانا پڑتا تھا۔ وقفوں کے دوران میس اسٹاف انہیں کھانا اور چائے وغیرہ ڈبے میں ہی دے جاتا۔ اگر انہیں کچھ کہنا ہوتا یا کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ فیلڈ ٹیلی فون پر کہہ دیتے تھے۔ اس طرح وہ بھی خوش تھے اور ہم بھی، وہ بھی آرام سے تھے اور ہم لوگ بھی، اس موقع پر مجھے ضمیر جعفری کا شعر یاد آتا ہے.....

میری بیوی قبر میں لیٹی ہے جس ہنگام سے
وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے

کوئٹہ میں استقبالیہ پروگرام بھی ویسا ہی پُرتکلف تھا جیسا کہ لاہور کا الوداعی پروگرام تھا، بس فرق تھا تو صرف چہروں کا یا چائے کا اہتمام کی جگہ کا۔ کوئٹہ میں چائے کا انتظام پلیٹ فارم کی بجائے یونٹ کے اپنے علاقے میں کیا گیا تھا۔ لاہور سے کچھ عرصہ پہلے بھیجی گئی ایڈوانس پارٹی نے رہائش وغیرہ کا یہاں سب انتظام کیا ہوا تھا۔ استقبالیہ پروگرام کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ فیملیز شروع میں اکٹھی رکھی گئیں، پھر جیسے جیسے گھر ملتے گئے، لوگ اپنے اہل خانہ کو شفٹ کرتے گئے۔ جب ہماری باری آئی تو ہم بھی شفٹ کرگئے۔ یونٹ میں سب افسروں اور ان کے گھر والوں کے درمیان بہت قریبی تعلقات ہوتے ہیں۔ وہ آپس میں بالکل رشتے داروں کی طرح ہوجاتے ہیں۔ یہاں بھی ہم سب گویا رشتے دار ہی بن گئے تھے اور لوگوں کا ایک دوسرے کے یہاں بالکل اسی طرح آنا جانا تھا جیسے رشتے داروں میں ہوتا ہے، سوائے کرنل صاحب اور ان کی فیملی کے۔ انہوں نے خود ہی فاصلہ اتنا رکھا ہوا تھا یونٹ میں بھی اور گھروں میں بھی۔ اہل خانہ میں تو فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ایک دوسرے کو پہچانتے بھی مشکل سے ہی تھے۔ ان کی بیگم بھی ہماری بیگمات سے ایسے ہی ملتیں جیسے کمانڈنگ افسر ہوں۔

فوج میں دستور ہے کہ جو بھی نیا افسر یونٹ میں آئے تو اسے اپنی فیملی کے ساتھ کمانڈنگ افسر کے گھر ایک دفعہ ضرور جانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا آنا جانا تعلقات کی نوعیت پر ہے۔ دستور کے مطابق ہم بھی کرنل صاحب کے گھر گئے، لیکن یہ ہمارا پہلا اور آخری وزٹ ثابت ہوا۔ اس کے بات نہ کبھی میرا دل ان سے ملنے کو چاہا اور نہ ہی میرے اہل خانہ کا اور قریباً سب ہی افسروں کے ساتھ یہی صورتِ حال تھی۔ یہ بھی دستور ہے کہ اگر کوئی افسر اہل خانہ کے ساتھ کمانڈنگ افسر کے گھر جائے تو جواباً کمانڈنگ افسر کو بھی اس افسر کے گھر جانا ہوتا ہے، لیکن ہمارے کمانڈنگ افسر نے کبھی اس کی زحمت ہی نہ کی۔

سنا ہے کہ انہوں نے مہمانوں کو دو درجوں میں تقسیم کررکھا تھا۔ یونٹ کے افسر اور عام لوگ نچلے درجے میں آتے تھے، جن سے وہ باہر لان میں یا ایک عام سے کمرے میں ملتے تھے، جبکہ بڑے لوگوں اور سینئر افسروں کے لیے ایک خاص ڈرائنگ روم مخصوص تھا۔ ان کے اس رویے کی وجہ سے یونٹ میں نیچے سے اوپر تک سب ہی نے اظہارِ نفرت کے لیے ان کے مختلف نام رکھے ہوئے تھے۔ کوئی انہیں ''مشکی'' کہتا تھا تو کوئی ''کالا ناگ'' اور کوئی ''فرعون'' سب ہی نام ان کی رنگت، اکڑی ہوئی گردن اور ان کے رویے کی وجہ سے معروف تھے۔

یونٹ میں ہر روز گیارہ بجے ''ٹی بریک'' ہوتا ہے، جس میں سب افسر اکٹھے چائے پیتے ہیں۔ ایک دن ٹی بریک کے دوران ان کا بھی کوئی بے تکلف دوست آیا ہوا تھا، جس کی وجہ سے وہ بھی ''بے تکلف'' موڈ میں تھے، جو

وہ عموماً بہت کم ہوتے تھے۔ باتوں باتوں میں ان کے لاہور کے فارم کی بات چھڑی، جو چلتے چلتے ان کے لاہور ریلوے اسٹیشن پر آئے مہمان تک جا پہنچی۔ کرنل صاحب نے بتایا کہ وہ ان کے لاہور بارڈر پر واقع ایگری کلچر فارم کا منیجر تھا۔ اس کے ضرورت سے زیادہ عاجزانہ اور خوشامدانہ رویے کی بات ہوئی تو کرنل صاحب ہنسنے لگے اور پھر یوں گویا ہوئے ''اس کا رویہ اب ہمیشہ ایسا ہی رہے گا، کیوں کہ میں نے اس کا کام ہی ایسا کیا ہے کہ اس کی گردن ہمیشہ نیچی ہی رہے گی۔'' ہم نے پوچھا تو انہوں نے اس کا قصہ بڑے فخر سے بتایا۔ کہنے لگے۔

''ایک دفعہ مجھے لاہور سے اس کا فون آیا کہ میں سخت مصیبت میں ہوں، خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میں سمجھا شاید زمین کا کوئی مسئلہ ہے، اس لیے جلدی ہی اس کے پاس زمینوں پر چلا گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اسے واقعی مصیبت میں مبتلا پایا، لیکن یہ زمین کا کوئی مسئلہ نہ تھا، بلکہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ گاؤں کے ایک بدمعاش جوان نے اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا تھا۔ وہ اتنا طاقتور اور اثر ورسوخ والا تھا کہ یہ اس کا اب تک کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا تھا۔ نہ تو ابھی تک اس کی بیٹی واپس ہوئی تھی اور نہ ہی اس کا بدلہ اُترا تھا۔ اس مسئلے کی وجہ سے اس کی اتنی بے عزتی ہوئی تھی کہ وہ گاؤں میں چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ معاملہ واقعی بہت سنگین تھا۔ یہ صرف میرے منیجر کی ہی بے عزتی نہیں تھی بلکہ میری اپنی بھی تھی، اس لیے میں نے ایسے اقدامات کا فیصلہ کیا کہ نہ صرف لڑکی ہی واپس ہو اور میرے منیجر کی عزت بحال ہو، بلکہ علاقے میں میرا دبدبہ اور رُعب بھی قائم ہو جائے، پھر ہُوا بھی یہی، نہ صرف یہ کہ لڑکی واپس ہوگئی، بلکہ وہ بدمعاش بھی میرے قدموں میں آ گرا۔'' ہم نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیا جادو کیا تھا۔'' تو انہوں نے بتایا کہ ''میں نے اپنے علاقے سے بندے بلائے اور اس لڑکے کی ماں کو اغوا کرالیا۔ لڑکا خود ہی لڑکی کو لے کر میرے قدموں پر آ گرا۔'' جب ہم نے پوچھا کہ آپ نے اس بدمعاش کے ساتھ کیا سلوک کیا تو ان کی گردن اکڑ گئی اور بڑے فخریہ لہجے میں بولے۔

''کچھ بھی نہیں۔ میں نے بس اس کی ٹانگیں تڑوا دیں اور باہر پھینک دیا، تاکہ ہمیشہ یاد رکھے اور اس کی ماں کو بھی چھوڑ دیا۔'' اس موقع پر ہمیں پنجابی فلم ''مولا جٹ'' کا کردار ''نوری نت'' یاد آ گیا۔ وہ بھی فلم میں ہیرو کے بھائی کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے۔ کرنل صاحب نے جس آرام، مزے اور فخر سے یہ داستان سنائی تھی، یوں لگا جیسے ہم سندھ کے کسی وڈیرے کی اوطاق یا جنوبی پنجاب کی کسی پنچایت میں بیٹھے ہوں۔ اس قصے کو سننے کے بعد کرنل صاحب کی دہشت تو اور بھی بیٹھ گئی، لیکن لوگوں کے درمیان ان سے نفرت اور فاصلہ اور بھی بڑھ گیا۔

کچھ عرصے بعد کرنل صاحب یونٹ سے غائب ہونے لگے۔ ویسے تو ان کی غیر حاضری مفاد عامہ میں تھی، اس لیے سب کو اچھی لگی، لیکن کچھ عجیب سی بھی لگی، پھر یہ غیر حاضریاں لمبی ہونے لگیں۔ وہ کئی کئی دن یونٹ سے غائب رہنے لگے۔ جب بھی آتے تو پریشان نظر آتے۔ ان کا گرجنا برسنا بھی کم ہوگیا تھا اور آہستہ آہستہ ان کی گردن سے سریا بھی نکل گیا اور نظر بھی جھکی جھکی نظر آنے لگی۔ اب انہیں خدا بھی یاد آنے لگ گیا تھا اور عام لوگ بھی۔ یہ حال بھی ہوگیا کہ وہ لوگوں سے دعا کی درخواست بھی کرنے لگے۔ ہم لوگ ان میں اتنی بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھ کر حیران تھے، لیکن جب حقائق کا پتا چلا تو ایمان تازہ ہوگیا۔

کرنل صاحب کا اکلوتا بیٹا مری کے کسی کالج میں پڑھتا تھا۔ باپ کی طرح اس کی گردن میں بھی نہ صرف سریا فٹ تھا، بلکہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اس کا دماغ بھی کافی خراب تھا۔ اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی، جس کے نتیجے میں اس کے ہاتھوں ایک لڑکا قتل ہوگیا۔ دونوں باپ بیٹا اس قتل کے سلسلے میں ایسے پھنسے کہ پھر کبھی نہ نکل سکے۔ کرنل صاحب نے بڑی کوشش کی، ہر طریقہ آزمایا، روپیہ پانی کی طرح بہایا، سب کچھ داؤ پر لگا دیا، لیکن کوئی بھی طریقہ کامیاب نہ ہوسکا، کیوں کہ مخالف پارٹی بھی ان سے کم نہ تھی۔ اس نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اس ایک واقعے نے انہیں توڑ کے اور برباد کر کے رکھ دیا۔ ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا تھا۔ ان کی تنی ہوئی گردن ایسی جھکی کہ پھر کبھی نہ اُٹھ سکی۔ کچھ عرصے بعد میری اس یونٹ سے باہر ٹرانسفر ہوگئی، بعد میں پتا چلا کہ کرنل صاحب نے بیٹے کی جان بچانے کے لیے اسے ملک سے کہیں باہر بھیج دیا اور خود بھی کہیں گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔

☆.....☆

قرشی

عرق شیریں

بچوں کے نظامِ ہضم کی اصلاح کیلئے مفید و مؤثر

قرشی انڈسٹریز کے شعبہ ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ نے انتہائی لطیف عرقیات (سونپا، سونف، پودینہ، گلاب) میں قند سفید کی آمیزش کے ذریعے ایک خوش ذائقہ اور کثیر الفوائد عرق "عرق شیریں" تیار کیا ہے، جو بچوں کی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

عرق شیریں کی افادیت:

- بچوں کے نظامِ ہضم کیلئے مفید و مؤثر ہے
- اسہال اور قے کا بہترین علاج ہے
- پیٹ درد، مروڑ اور نفخ (پیٹ کا پھولنا) میں مفید ہے
- دانت نکلنے کے دوران ہونے والی تکلیف سے آرام پہنچاتا ہے